محمد الیاس خان

وسطی ایشیا میں اقتصادی مفادات کی جنگ: "طالبان" کا کردار

تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان وسطی ایشیا کی تین ایسی جمہوریائیں ہیں جن کی سرحدیں جنگ زدہ افغانستان سے ملتی ہیں۔ جمہوریہ تاجکستان میں اس وقت اسلام پسند اور جمہوریت نواز سیاسی قوتوں اور روس نواز کمیونسٹوں کے درمیان خانہ جنگی جاری ہے۔ بتیس ہزار سے زائد روسی فوجی تاجک افغان سرحد پر متعین ہیں۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد ان نوآزاد مسلم جمہوریاؤں میں روسی فوج کی موجودگی کے مقاصد کیا ہیں؟ بظاہر روسی فوج کی تعیناتی کا مقصد ان جمہوریاؤں میں امن عامہ کی صورت حال برقرار رکھنا ہے مگر اس عمل کے درپردہ مقاصد میں روس کے اقتصادی اور تزویراتی مفادات کے تحفظ کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ تاجکستان میں روسی فوج کے کمانڈر آندری نیکولیف جمہوریہ میں روسی فوج کی تعیناتی کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "ہم تاجکستان میں روس کے تزویراتی مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے متعین ہیں۔ ہم یہاں کپاس، نایاب دھاتوں اور توانائی کے وسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"

ماسکو اس وقت جمہوریہ تاجکستان میں جو کردار ادا کر رہا ہے اور اس سے قبل دیگر سابق سوویت جمہوریاؤں میں "مداخلت برائے امن کاری" کے نام سے جو کردار ادا کرتا رہا ہے اس کا ایک مقصد عالمی منڈی تک وسطی ایشیا کے وسائل توانائی کی ترسیل کے لیے جاری ایسی تمام کوششوں میں رخنہ ڈالنا ہے جن کے نتیجے میں خطے میں اس کی بالادستی کو خطرات درپیش ہو سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین کو عالمی نقشے سے غائب ہوئے پانچ برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے مگر ابھی تک سابق سوویت جمہوریاؤں میں ہزاروں روسی فوجی بدستور تعینات ہیں۔ روس بیرونی طاقتوں کی طرف سے وسطی ایشیا میں اثر و نفوذ حاصل کرنے کی کوششوں میں اس وقت تک رکاوٹیں ڈالتا رہے گا جب تک خطے میں اس کی برتر طاقت کی حیثیت بین الاقوامی طور پر تسلیم نہیں کر لی جاتی۔ روس سوویت یونین کے انہدام کے بعد بھی سابق سوویت ریاستوں کو کریملن کا "منطقۂ نفوذ" [area of influence] سمجھتا ہے اور خطے کو ماسکو کی بالادستی کے تابع رکھنے پر مصر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بدلتے ہوئے عالمی حالات میں خطے پر اپنی گرفت برقرار رکھنے کے لیے سرِدست وہ علانیہ جارحانہ اقدامات اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں

ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد اس کی جانشین ریاست رشین فیڈریشن ایک ایسے عبوری دور سے گزر رہی ہے جس میں اسے خود اپنے ریاستی اداروں کی بقاء کے لیے زبردست جدوجہد کا سامنا ہے۔ مزید یہ کہ عالمی نقشے پر ایک بر ترطاقت کی حیثیت سے اپنی پوزیشن برقرار رکھنا اس کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ماسکو جب تک اپنی داخلی اور خارجی سیاست کے متضاد عوامل کے نتیجے میں پیدا شدہ سنگین صورت حال پر قابو نہیں پا لیتا اس وقت تک وہ اس پوزیشن میں قطعاً نہیں ہے کہ وہ سابق سوویت سلطنت کی تعمیر نو اور خاص کر اپنی سابقہ ایشیائی مستعمرات پر کریملن کی بالادستی کے از سر نو قیام کے لیے براہ راست اقدام کرے۔ چنانچہ وہ اس عبوری دور میں مختلف حیلے بہانوں سے خطّے کے اندر اپنے عسکری تواجد کو انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔

اگرچہ وسط ایشیائی جمہوریائیں تاحال اپنی برآمدات کے لیے روسی گزر گاہوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ تاہم وہ مستقبل سے متعلق روسی عزائم سے بے خبر نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ بیرونی تجارت کے لیے روسی گذر گاہوں پر مکمل انحصار کی موجودہ کیفیت کے خاتمہ کی غرض سے متبادل گزر گاہوں کی تعمیر کے لیے کوشاں ہیں۔ ازبکستان کا جھکاؤ واضح طور پر مغرب کی طرف ہے۔ آذربائیجان بھی مغربی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات کے قیام کا خواہاں ہے۔ اگرچہ موسم گرما میں اسے روس اور ایران کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے مغربی ممالک کے ساتھ موبل آئل کے لین دین سمیت بحیرہ کیسپئین کے آذری سواحل سے گیس کے اخراج کا ایک بڑا معاہدہ منسوخ کرنا پڑا ہے۔

قدرتی وسائل سے مالامال جمہوریہ قازقستان نے بھی ترکی کے ساتھ دفاعی اور صنعتی تعاون کے متعدد معاہدات پر دستخط کیے ہیں۔ امریکہ نے حال ہی میں قازقستان کو بحیرہ کیسپین کے قازق سواحل کی نگرانی کے لیے چھ ساحلی گشتی جہاز دیے ہیں۔ وسط ایشیائی جمہوریاؤں میں اس وقت کئی مسلم اور مغربی ممالک کی سرمایہ کار کمپنیاں بھی مصروف کار ہیں۔

ظاہر ہے روسیوں کو خطے میں غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق ایسی سرگرمیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں جن میں "روسی مفادات" کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ان جمہوریاؤں میں سرمایہ کاری کی ایسی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے روس کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتا ہے۔ وہ با آسانی سابق سوویت جمہوریاؤں میں آباد روسی النسل باشندوں یا اقلیتی گروہوں کو شہ دے کر نسلی تنازعات برپا کرا سکتا ہے جن کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ خطّے میں بیرونی سرمایہ کاری کا عمل رُک جائے گا بلکہ سیاسی عدم استحکام کی ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے جو ماسکو کو براہ راست مداخلت کے مواقع مہیا کرے گی۔

نو آزاد وسط ایشیائی جمہوریاؤں کو اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ حقیقی آزادی ہی ان کی اصل قوت ہے اور یہ کہ اقتصادی استحکام ہی مستقبل میں ان کی حقیقی آزادی کی ضمانت ثابت ہو گی۔

اقتصادی استحکام اور معاشی خوشحالی کے حصول کے لیے متبادل تجارتی گزر گاہوں کی دریافت ان کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ وہ اپنی مصنوعات اور وسائل توانائی کی برآمدات عالمی منڈی میں ان کی قیمتوں کے مساوی زر مبادلہ کے بدلے میں فروخت کرنا چاہتی ہیں۔ اس وقت روسی تجارتی گزر گاہوں پر مکمل انحصار کی وجہ سے ان جمہوریاؤں کو اپنی مصنوعات اور خام مواد اصل سے کئی گنا کم قیمت پر روس کو فروخت کرنا پڑ رہی ہیں۔

اس تناظر میں افغانستان میں طالبان کی پے در پے کامیابیوں اور بالآخر ان کے ہاتھوں سقوط کابل کے بعد روس کو وسطی ایشیا میں اپنے اقتصادی مفادات خطرے میں دکھائی دینے لگے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کریملن کے موجودہ حکمران تاحال سرد جنگ کے دوران کی بین الاقوامی طرزِ سیاست کے اسیر ہیں۔ وہ جب تک سابق سوویت یونین کے علاقوں کو ایک بار پھر براہ راست اپنی حقیقی بالادستی کے تابع کرنے کے قابل نہیں ہوتے ان علاقوں میں "مغربی گماشتوں" کے اثر و نفوذ کی راہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ دوسری طرف (اس عبوری دور میں) انہیں ان نوآزاد ممالک کو یہ تاثر بھی دینا ہے کہ ماسکو ان کے جائز اقتصادی مفادات کا تحفظ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف سے "مغرب مخالف ایران" کے راستے متبادل تجارتی گزر گاہوں کی تعمیر اور تہران کی اس خطے میں اقتصادی سرگرمیوں کو ماسکو کی اشیر باد حاصل ہے۔ افغانستان میں طالبان کی فتح ماسکو کی ان پالیسی ترجیحات سے متضاد ہے۔ روس کو حقیقی خطرہ اس بات سے ہے کہ طالبان کی پشت پناہی "مغرب نواز پاکستان" اور خود امریکہ کر رہے ہیں اور پورے افغانستان پر طالبان کے قبضے کی صورت میں وسطی ایشیا کی ریاستوں کو افغانستان کے راستے کھلے سمندر کی پاکستانی سواحل تک ایک ایسی متبادل تجارتی گزر گاہ مل جائے گی جو خطے کے اقتصادی مستقبل کو مغرب اور اس کے "حواریوں" سے وابستہ کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ذرائع ابلاغ سے کابل پر طالبان کے قبضے کی خبر نشر ہوتے ہی صدر یلسن نے، جو ان دنوں بیمار تھے اور ہسپتال میں داخل تھے، وزیر اعظم چرنومیرڈین کو قازقستان کے دارالحکومت الماتا میں جلدی میں بلائے گئے وسط ایشیائی جمہوریاؤں کے ایک سربراہی اجلاس میں شرکت کے لیے پیغام بھیجا۔ روسی سیکورٹی کونسل کے سابق سربراہ الیگزنڈر لیبڈ نے تو یہاں تک کہا:

> "روس کو معزول صدر برہان الدین ربانی کی حکومت بحال کرنے کے لیے مدد کرنی چاہیے۔ اگرچہ افغانستان پر روسی قبضے کے نتیجے میں ہونے والے بھارتی جانی اور مالی نقصان کے بعد افغانستان پر ایک بار پھر (روس کی طرف سے) حملہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

کچھ حلقوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ طالبان تنظیم کی "توسیع پسندی" اور "بنیاد پرستی" افغانستان میں ان کے اقتدار کے خلاف روسی ردعمل کی بنیادی وجہ ہے۔ لیکن اس قسم کا تجزیہ حقائق پر

مبنی دکھائی نہیں دیتا۔ اس بات میں شک نہیں ہے کہ روسی اور وسطی ایشیا کے سابق کمیونسٹ حکمران "اسلامی بنیاد پرستی" سے خائف ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ "بنیاد پرست اسلام" کو بزور طاقت کچلنے کی پالیسیوں سے ناامید ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ اسلامی تحریک اور خاص کر "عسکریت پسند انقلابی اسلام" کے ساتھ co-exist کرنے کی حکمت عملی کو زیادہ موزوں اور مفید سمجھنے لگے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ طالبان "روایت پسند" اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کابل کے سابق حکمران (ربانی، احمد شاہ مسعود اور حکمت یار) ان جہادی قوتوں کے رہنما ہیں جنہوں نے سابق سوویت یونین کی شکست و ریخت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ وسطی ایشیا اور خود روس میں اسلامی بنیاد پرستی اور "انقلابی اسلام" کی تقویت کا باعث "روایت پسند طالبان" نہیں بلکہ "عسکریت پسند اور انقلابی" مجاہدین رہنما بن سکتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود روسی اور وسط ایشیائی حکمران طالبان پر سابق جہادی قوتوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہیں بنیاد پرستوں کے ساتھ co-exist کرنا نسبتاً سہل نظر آتا ہے (اور خاص طور پر اس پس منظر میں کہ روسی اور وسط ایشیائی حکمران گذشتہ تقریباً اٹھارہ سال سے افغانستان کی بنیاد پرست انقلابی جہادی قوتوں کے ساتھ حالت جنگ میں رہنے کی وجہ سے ان کی خوبیوں، خامیوں اور صلاحیتوں [potentials] سے بخوبی آگاہ ہیں) اس کے برعکس ایسے "نو دریافت مغربی گماشتوں" سے معاملہ کرنا وہ خطرات سے خالی نہیں سمجھتے ہیں جن کا ایجنڈہ ہی ابھی تک واضح نہیں ہے۔

روسیوں اور وسط ایشیائی حکمرانوں کی طرف سے اختیار کردہ بنیاد پرستوں کے ساتھ co-exist کرنے کی حکمت عملی کا ایک واضح ثبوت "بنیاد پرست ایران" کے ساتھ ماسکو اور دیگر وسط ایشیائی دارالحکومتوں کے نسبتاً خوشگوار تعلقات ہیں۔ دراصل ایران وسطی ایشیا میں اپنی سرگرمیاں ماسکو کو اعتماد میں لے کر جاری رکھے ہوئے ہے۔ روسیوں کو بخوبی معلوم ہے کہ ایران کس حد تک جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ ایران اور مغرب کے درمیان کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش کے مستقبل میں بھی جاری رہنے کا امکان ہے۔ روسی یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل قریب میں مغرب اور ایران کے درمیان افہام و تفہیم کے امکانات کم ہیں۔ اس لیے وہ ایران کی سرگرمیوں سے زیادہ خائف نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ماسکو وسط ایشیائی جمہوریاؤں کو گھٹن اور ناامیدی کی کیفیت سے بھی باہر نکالنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ انہیں ایران کے راستے بھی بیرونی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا تو یہ جمہوریائیں کلیتاً اس کے اثر و نفوذ سے آزاد ہونے کی راہ اختیار کر سکتی ہیں۔

یہاں ایک سوال توجہ طلب ہے کہ طالبان اگرچہ مبینہ طور پر امریکہ، مغرب اور علاقے میں موجود "مغربی گماشتوں" کے حمایت یافتہ ہیں تاہم افغانستان میں ان کے مکمل اقتدار کے نتیجے میں اس بات کا امکان ہے کہ خطے میں سیاسی استحکام پیدا ہوگا جو وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف سے روسی بالادستی سے

نکلنے اور متبادل تجارتی گذرگاہوں کی تعمیر کی کوششوں میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ ایسی صورت حال میں وسط ایشیائی ریاستیں روسی موقف کی تائید کیوں کر رہی ہیں؟ یہ ایک انتہائی مشکل سوال ہے۔ لیکن بہرحال حالات و واقعات اور بعض زمینی حقائق کے باریک تجزیے سے اس سوال کا جواب بھی باسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح سے پاکستان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ افغانستان میں پشتون قبائل کی حکمرانی رہے۔ پشتون بیلٹ کے دونوں ممالک میں تقسیم ہونے کی بنا پر پاکستان کے پشتونوں کے ہم نسلوں کی کابل پر حکمرانی کو بوجوہ اسلام آباد افغانستان میں اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں اہمیت کا حامل سمجھتا رہا ہے۔ بعینہ یہی کیفیت افغانستان کے شمالی سرحدات کی ہے جہاں من جملہ دیگر غیر پشتون قومیتوں کے ازبک، تاجک اور ترکمن قبائل آباد ہیں۔ چنانچہ پڑوسی وسط ایشیائی ریاستوں کی بھی یہ خواہش فطری ہے کہ ان کی سرحدات سے متصل افغانستان کے کم ازکم ان علاقوں میں جہاں ان کے ہم نسل آباد ہیں، ان کے ہم نسل قبائل کا تسلط رہے۔ ربانی، مسعود اور دوستم نظریاتی طور پر وسط ایشیائی حکمرانوں کے حریف ہوسکتے ہیں لیکن اس کے باوجود وسط ایشیائی حکمران ان کی تائید کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پارہے ہیں۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ افغانستان کی تاجک اور ازبک آبادی میں ان سربرآوردہ "بنیاد پرست" قائدین کی متبادل "غیر بنیاد پرست" شخصیات موجود نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے اپنی سرحدات پر دستک دینے والے فوری خطرات کا تدارک طالبان کے اقتدار کی صورت میں پاکستان کی بندرگاہوں تک ان کی رسائی کے طویل المیعاد مفاد سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

طالبان کون ہیں؟ اور افغانستان میں ان کی تیز رفتار پیش قدمی کے اسباب کیا ہیں؟ ان سوالات کے تفصیلی جوابات کی تلاش ہمارے اس پرچے کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ بہرحال اگر ان الزامات کو درست مان لیا جائے کہ طالبان "امریکی اور پاکستانی ایجنسیوں" کی پیداوار ہیں تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ طالبان کی پشت پناہی کے پس پردہ پاکستان کے اصل مقاصد کیا تھے؟ پاک - افغان تعلقات کی عصری تاریخ اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ نجیب اللہ حکومت کے خاتمے کے بعد پاکستان کی افغان پالیسی ناکامیوں سے دوچار ہوئی۔ اور نتیجتاً کابل اور اسلام آباد میں فاصلے بڑھتے گئے۔ پاکستان متحارب مجاہدین فریقوں میں صلح کرانے میں ناکام رہا۔ جس کی بنیادی وجہ بعض حلقوں کے مطابق شاید یہ تھی کہ اسلام آباد کی افغان پالیسی میں مغربی مفادات کے تحفظ کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی۔ دوسری طرف افغانستان میں خانہ جنگی کی طوالت وسطی ایشیائی ریاستوں میں اثرورسوخ اور تجارتی و اقتصادی مفادات کے حصول کی پاکستانی کوششوں میں زبردست رکاوٹ بنی رہی۔ چنانچہ ["بنیاد پرستی" سے اظہار براءت کرنے والی اور "بنیاد پرستی" کے خلاف صف آرا ہونے کی برملا دعویدار] پاکستان کی سابقہ حکومتوں کی یہ خواہش رہی ہے۔ کہ افغانستان میں ایسی قوتوں کو برسراقتدار لایا جائے جو افغانستان اور وسطی ایشیا میں

[ان کی طرف سے متعین کردہ] پاکستانی مفادات کی محافظ ہو۔ قطعیت سے یہ کہنا تو شاید مشکل ہے کہ طالبان پاکستان کی تخلیق ہیں تاہم ایسی رپورٹیں منظرعام پر آچکی ہیں کہ پاکستان نے طالبان کو مادّی اور عسکری امداد فراہم کی۔ یوں لگتا ہے کہ اسلام آباد وسطی ایشیا میں اپنے اقتصادی و تجارتی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں کابل میں حکمران جہادی قوتوں سے مایوس ہو چکا تھا۔ ربانی حکومت کے ساتھ اسلام آباد کے سابق حکمرانوں کے تعلقات "دشمنی" کی حد تک خراب ہو گئے تھے۔ دوسری طرف پاکستان زبردست اقتصادی بحران کا شکار رہا ہے۔ ملک میں وسائل توانائی کی طلب و رسد میں فرق برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ پاکستانی حکام وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ زمینی روابط کے قیام کے لیے بے تاب نظر آنے لگے۔ اسلام آباد محسوس کر رہا تھا کہ وسطی ایشیائی ریاستوں کے ساتھ تجارتی روابط کے قیام میں وہ دیگر پڑوسی ریاستوں سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان نے واقعی طالبان کی پشت پناہی کی ہے تو منجملہ دیگر مقاصد کے اس کا ایک اہم ہدف وسط ایشیائی ریاستوں تک تیز تر رسائی رہا ہوگا۔

مگر کیا طالبان کے کابل میں برسراقتدار آنے سے پاکستان اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو گیا ہے؟ شاید نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ طالبان کی مبینہ پشت پناہی کرتے وقت پاکستان وسط ایشیائی جمہوریاؤں کو اعتماد میں نہیں لے سکا۔ افغانستان میں اس اچانک تبدیلی سے وہ بوکھلا اٹھی ہیں۔ اور انہیں اپنی علاقائی سالمیت خطرے میں نظر آنے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وسط ایشیائی جمہوریاؤں کی حکومتوں نے "بنیاد پرست" احمد شاہ مسعود اور پروفیسر برہان الدین ربانی کو نہ صرف "روایت پسند" طالبان پر ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے بلکہ جمہوریہ تاجکستان احمد شاہ مسعود اور جمہوریہ ازبکستان طالبان کے مقابلے میں عبدالرشید دوستم کی علانیہ حمایت پر اتر آئی ہیں۔ بظاہر لگتا ہے کہ پاکستان کے لیے طالبان کی مبیّنہ پشت پناہی [counter-productive] ثابت ہوئی ہے۔ اور وسط ایشیائی جمہوریاؤں کی دارالحکومتوں میں اسلام آباد کے لیے خیرسگالی کے جذبات بڑھنے کے بجائے کم ہو گئے ہیں۔